

# سلسلہ پیل

نایاب حیاتی

چودھویں قسط کا خلاصہ

میکوڈ روڈ پر سینما کے ساتھ ایک پرانی لیکن بے حد پائیدار عمارت جو کافی عرصے سے بے آباد پڑے تھی وہاں ایک ڈاکٹر نے اپنی دو بیٹیوں کے ساتھ جو کہ کم تھیں رہائش اختیار کر لی تھی۔ وہ اپنی بیٹیوں کو صبح ہوپٹل ساتھ لے جاتا اور شام کو واپس آتا۔ ساری کالونی کے لوگوں کے لیے ان باپ بیٹیوں کی محبت و خشک کا باعث تھی۔ اسی کالونی میں شافیہ نامی لڑکی رہتی تھی جس کا باپ نہیں تھا اسے ان دونوں بچیوں پر پناہ دلچسپی تھی اور اس کی وجہ ان کے باپ کی ان کے ساتھ محبت تھی جبکہ کالونی کی باقی لڑکیاں اس ڈاکٹر پر فدا تھیں۔

مسز جس نامی خاتون بھی وہیں اپنے شاندار گھر میں رہائش پذیر تھیں جن کا ایک سوتیلہ بیٹا تھا۔ ہشام بھی جو کہ امریکہ میں تھا۔ شافیہ کی سوتیلی والدہ تھیں اور مسز جس کی بیٹی تھی جس کی نظر اپنی جھجیو کی جائیداد ہوتی ہے جو کہ انہوں نے اپنے سوتیلے بیٹے کے لیے سنبھال رکھی ہے۔ وہ اپنی بیٹی سمیرا کی سوتیلی بیٹی شافیہ سے بے پناہ پیار کرتی ہیں اور یہ بات سمیرا کی بیٹیوں کو بھی پتہ نہیں ہو رہی۔

پندرہویں قسط

اب آپ آگے پڑھئے





”صنوبر کا ایک درخت بلند شاہی چوٹی پر  
تن ہوا سفید نعل میں سو رہا ہے،  
جس پر برف کے پردے تھے ہوئے ہیں  
صنوبر کا یہ درخت اس کا خواب ہے  
جو دور دراز مشرقی سرزمینوں کے  
چلتے ہوئے صحراؤں میں اکیلا  
خاموشی سے روتا ہے۔“

سفید بادلوں کو چرتا ہوا جہاز اس اجنبی زمین پر لینڈ کر رہا تھا جو شافیہ کے خوابوں کی زمین نہیں تھی  
راستہ بھر وہ حیرت سے ان لوگوں کو سنتی رہی جو پاکستان کی برائیاں کر رہے تھے یہ لوگ صدیوں پہلے  
مغرب میں آباد ہو چکے تھے دیکھا جائے تو پاکستان میں اس وقت کچھ بھی نہیں تھا ایک تباہ حال معیشت  
غیر محفوظ مستقبل اور مایوس نئی نسل لوگ دھوا دھوا ہجرتیں کر رہے تھے۔  
جو بھی تھا اپنا ملک تو تھا نا شافیہ کو خبر نہیں تھی کہ زندگی کس موڑ پر لے آئی ہے مگر یہ کہ جی جی نے جو  
فیصلہ کیا تھا اس نے اسے دل و جان سے قبول کیا۔ جی جی اس کے لیے بھی برا سوچ ہی نہیں سکتی تھیں  
اس بات کا شافیہ کو پورا یقین تھا راستے میں ہشام نے اسے چار یا پانچ بار مخاطب کیا تھا ایک بار بلینکٹ  
اوڑھاتے ہوئے دوبار کھانے کے لیے اور ایک بار یہ بھی پوچھا تھا کہ ”جہاز کے سفر میں ڈر تو نہیں لگ  
رہا۔“

شافیہ نارمل ہی تھی نجانے کیوں دل سے تمام خوف دور ہو چکے تھیں ہاں ہر ملک اور ہر نسل کے لوگ  
تھے خاص طور پر جس علاقے میں ہشام رہتا تھا یہاں زیادہ تر ہجرت زدہ لوگ تھے کچھ آسٹریلیا کے  
ملک جنگوں میں تباہ ہو چکے تھے۔  
”نسل در نسل

ہم نے اپنی جوانی بے ضرر گناہوں میں گزاری  
لے وقعت سی محبت میں باہم جٹلا  
ہم اکثر سمجھتے کہ ہم کسی بات پر آزرده ہوئے ہیں  
مگر کوئی دکھ دیر پا نہ ہوتا  
کوئی ضرب ہمیں زخم نہ لگاتی  
ہمارے سر دھن کوئی نہ کر پاتی

ہر موسم میں ہم دراز رہے، بیٹھے ہوئے، نہیں  
صلیبوں پر نہیں بلکہ نرم بستروں پر  
گداز جسموں کے ساتھ، جبکہ آہ وزاری کرتی  
حساس گھڑیاں شام اور صبح کے جھپٹے میں

نیم خواب اور نیم مدہوشی کے عالم میں گزرتی چلی جاتیں  
ہم خود پیردگی کے قائل تھے، ہر چیز کے آگے ہتھیار ڈال دیتے۔

یادوں کے لیے، دیواروں اور کونوں کو کھرچنا ہمارا کام نہیں،  
نہ ہی موت سے سوال کرنا،  
لیکن جیسے بچے ہاں کے بازوؤں سے مانوس ہوتا ہے  
ہم اپنے آپ کو آگ کے  
یا بھوکے زمین کے سپرد کریں گے  
آہستہ آہستہ نکلے جانے کے لیے۔  
کوئی اپنی صلیبوں سے اتر کر ہمیں  
اپنے زخم نہیں دکھائے گا  
خاموشی میں گم ہو جانے والا کوئی خدا  
اجانک بات نہیں کرنے لگے گا،  
کوئی کھوئی ہوئی محبت  
ہماری بدلی نہ ہوگی،

نہ ہمیں بھی سابقہ حیثیت میں بحال کیا جائے گا  
نہ ہمیں نیا بین عطا کیا جائے گا۔“

ایک روشن گھر شافیہ کا منتظر تھا اس کی زندگی میں بہت اچانک یہ موڑ آیا تھا پوری زندگی ایک دہائی  
پہل گئی تھی اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس خواب نگر میں اتنا اچانک آسکتی ہے؟  
یہ اس کی بڑی خوش نصیبی تھی یا آزمائش؟  
حمر وہ بہت خوش تھی اور حیران بھی زندگی کا یہ موڑ اس کے تصور سے بہت بڑھ کے تھا دوسری  
طرف ہشام کے کیا تاثرات تھے؟ وہ شافیہ کو نہیں جانتا تھا وہ اس کے لیے اجنبی تھی  
تو کیا شافیہ کا مطالعہ ضروری تھا؟

”بات یہ ہے کہ عورت تو چیز ہی ایسی ہے کہ تم چاہے کتنا ہی اس کا مطالعہ کرلو پھر بھی سب کچھ بالکل  
نیا ہی ہوگا۔“

”تو پھر بہتر یہی ہے کہ مطالعہ کیا ہی نہ جائے“

اسے ایک مشہور قول یاد آ رہا تھا

”نہیں، کسی ریاضی دان نے کہا ہے کہ اصل خوشی سچائی کو دریافت کر لینے میں نہیں بلکہ اس کی  
تلاش میں ہے۔“

دو دن تھکن اتارنے میں گزر گئے تھے تیسرے دن ہشام نے شافیہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے سارا گھر  
دیکھا یا تھا وہ بہت سنجیدہ تھا

”یہ میرا گھر ہے۔ میرا ذاتی گھر جواب آپ کا بھی گھر ہے اس گھر میں جو کچھ ہے وہ سب آپ کا  
ہے آپ اسے جیسے مرضی استعمال کر سکتی ہیں یہ گھر بہت اچھی لوکیشن پر ہے اس کے آس پاس پرفضا  
دیہات ہیں اور آب و ہوا بہت بہترین ہے۔“ وہ دیکھے انداز میں بول رہا تھا اس کا انداز مودہ لینے والا  
تھا۔







لائٹن کا شیشہ سرکائے، وہ خلی شیشے میں پلٹ دے۔ باہر کمر بھری ہوا چل رہی ہے۔ ان کی ہاں لٹاف اور سسے بند کی وادیوں میں گم ہے۔ لوکیں نے شیشہ اٹھاتے ہی لوٹی کو بلایا تو اس نے فوراً خلی کا منہ پھیل کر شیشے میں پلٹ دی۔ لوکیں نے فوراً ہی شیشے کو گھما کر بند کیا اور دامن سے مٹی کی تہہ کو صاف کر دیا۔ ایک لمحے میں لائٹن کا شیشہ ہلکا سا روشن ہوا۔ دسیوں جگنوؤں نے اتنی روشنی ضرور کر دی تھی کہ وہ جانوروں کے پاس چلے جاتے۔ لوٹی لائٹن اٹھا کر دبی کے پاس آیا تو خوشی سے لوکیں کو آوازیں دینے لگا، اس نے فٹے کھنکھے کو چوما، وہ سفید اور ملائم تھا۔۔۔ نازک اور کوسا کوسا۔۔۔ لوٹی سوچ رہا تھا کہ میٹا بھی برف کی طرح سفید ہے لیکن برف تو بڑی ٹھنڈی ہوتی ہے اور یہ میٹا بڑا گرم ہے۔ لوٹی بار بار کھنکھے کو چومتا اور اس کے گرم وجود پر ہاتھ پھیرتا۔ اس نے دبی کے سر کے پاس جا کر کہا: ”اچھی دبی! تمہارا شکر یہ۔“ لائٹن کی مدہم روشنی میں لوٹی دبی کے پاس بیٹھا خوشی منارہا تھا جبکہ شیشے میں کئی ننھے ننھے دم توڑ رہے تھے۔

وہ سانس روکے آخری لائن پڑھ رہی تھی  
اس کے ننھے خوب صورت لکھائی میں شاید اس کتاب کو سب سے پہلے پڑھنے والے نے لکھا تھا  
احمد شاملو کے دل کی آواز

”ہمارے دل ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے

کہ ہم اس دنیا میں کہاں ہیں

دور ہیں مگر (دل سے) نزدیک ہو کر

میں قریب رہ کر بھی دور ہونے سے ڈرتا ہوں۔۔۔

دل ہاں یا کہ ہم نزدیک باشند

دیگر چہ فرقی می آئے کند

کہ کجای این جہان باشم

دور باش اما نزدیک،

من از نزدیک بودن ہای دوری ترسم۔۔۔

”آہاں ابھی کھوتا نہیں میرے اس خزانے میں تم کھو جاؤ گی مگر ابھی کھوتا مت میں تم کو کچھ اور دیکھا تا ہوں وہ شلف سے نایاب کتب نکال کر جیسے اسے سمجھا رہا تھا کہ تمہارا زیادہ وقت ان کے ساتھ ہی گزر سکتا ہے بہتر ہے ان کتابوں کے ساتھ مانوس ہو جاؤ

فارن ہائیٹ ۱۵۳۔ ۴۵۱ Fahrenheit ہے

وہ مسکرایا تھا یا شافیہ کو وہم سا لگا

یہ کتاب شاید زندگی کا ایسا تحفہ ہے جسے زندگی میں کھونے کا کبھی کوئی ڈر نہیں ہوتا۔ باقی تو زندگی دوسروں کے کھوجانے کو کہتے ہے۔ ”رے برادر بھری“ شاید اسی قسم کے انسان تھے جس نے اپنا سب کچھ کتاب کے ساتھ جوڑا۔ اور اسکا ناول ”فارن ہائیٹ ۱۵۳“ اسی کتاب دنیا کے بارے میں

جسے ابجے ان کی دنیا اور شاید ہمیشہ سے کبھی اپنا جانا ہی نہیں۔ اپنا حیات تو دور، کبھی اس کو دیکھا تک نہیں۔ وہ کتاب جس اپنے اندر تہذیبوں اور ثقافتوں کے رازوں کو سینے سے لگا ہوا، وہ کتاب جو ہمیں اپنے آپ سے روشناس کرنی اور روشنیاں نکھیرتی ہوئی ہر خاص و عام کے دلوں کو منور کرتی۔ ”فارن ہائیٹ“ اسی طرح ہمیں ایسی دنیا میں لیجاتی ہے جہاں پہ کوئی پڑھنے والا نہیں، کوئی دیکھنا والا نہیں، بالخصوص اس عالم انسان میں جس میں وہ بصارت ہی نہیں جو دنیا کو باپ سکے۔ ”فارن ہائیٹ ۱۵۳“ کی اہمیت شاید اس وجہ سے بھی ہے کہ وہ ہمیں اپنی دنیا کے بارے میں بتا رہا ہے۔ جہاں باتیں کرنے والے تو زیادہ لیکن پڑنے والے نہیں۔

یہ کتاب ۱۵۹۱ء میں لکھی گئی ہے جو کہ ”دسٹوپیان ادب“ dysopian literature میں آتا ہے۔ تم غمخیز اور غم نہیں مگر تم واقعی ہی ٹھیک سمجھ رہی ہو یہ جگہ تمہارے بہت کام آنے والی کیونکہ تم ایک ڈاکٹر کی بیوی ہو یہ یاد رکھنا کہ مسیحا کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہوتی وہ دوسروں کی زندگی بچانے کی تھک

دور کرتا ہے۔  
تم کو سب کچھ ملے گا ہر کہانی کے اندر تم کو ملے گا تو یہ تمہاری کہانی ہے یا میری یعنی ہشام کی ہے  
میں ایسے ہی لگتا ہے جیسے ہر کہانی مصنف نے میری لکھی تھی  
جیسا کہ مویان کی کہانیاں

ایسے لگتا ہے وہ میرے جذبات لکھا کرتا تھا

شاید تم کو بھی یہی لگے کہ یہ سب تمہارے لیے لکھا گیا ہے مگر اسے بھی لازمی پڑھنا۔

وہ اسے ایک اور چکنی کتاب پکڑا رہا تھا یہ صرف کتابیں نہیں تھیں یہ بات شافیہ جان چکی تھی یہ اس کی مستقبل کی ساتھی تھیں دوست بھی اور محبوب بھی  
”چین کے نوبل یافتہ ادیب“ مویان کی دو کہانیاں گوئی سن سکتی ہو؟

”میرا خیال ہے کہ آپ سب لوگ ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ کے ذریعے شمالی گاؤں قصبے کے بارے میں جانتے ہوں گے۔۔۔ آپ نے میرے نوے سالہ بوڑھے والد کو دیکھا ہوگا۔ اس کے علاوہ آپ نے میرے بھائیوں، میری بہن میری بیوی اور میری بیٹی حتی کہ میری پوتی کو بھی دیکھا ہوگا جو کہ اب ایک سال اور چار ماہ کی ہے، لیکن اس وقت میں سب سے زیادہ جس کو یاد کر رہا ہوں وہ میری والدہ محترمہ ہیں، جو اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔ کاش کہ آج وہ بھی یہاں اس قریب میں ہوتیں۔۔۔ میری والدہ 1922ء میں پیدا ہوئیں اور 1994ء میں اس جہان سے کوچ کر گئیں۔ ہم نے ان کی تدفین گاؤں کے مشرق میں آڑو کے ایک باغ میں کی تھی۔ گزشتہ برس ہمیں ان کی قبر کو گاؤں سے مزید آگے منتقل کرنا پڑا کیونکہ وہاں سے نئی ریلوے لائن کو گزرتا تھا۔ جب ہم نے ان کی قبر کشائی کی تو تابوت گل چکا تھا اور ان کا جسم مٹی میں مل چکا تھا۔ اس لیے ہم نے اس پاس کی مٹی بھی کھود ڈالی، ایک علامت کے طور پر، اور پھر انہیں نئی قبر میں لے گئے۔ یہ وہ لمحہ تھا جب مجھے احساس ہوا کہ میری والدہ اس زمین کا حصہ بن چکی ہے اور جب میں دھرتی ماں سے مخاطب ہوتا ہوں تو دراصل اپنی والدہ سے مخاطب ہوتا ہوں۔۔۔

میں اپنی ماں کا سب سے چھوٹا بچہ تھا۔



۴۴ ایک یاد رکھنی تھی کہ وہ بیکوم بول میں پانی بھر کر لانا میری ابتدائی یادوں میں سے ایک یاد ہے۔ بچنے کے اختتام پر میں بھوک سے غمگین تھا۔ اس لیے بول میں میرے ہاتھ سے گری اور ٹوٹ گئی۔ ذرا کے مارے سارا دن میں بھوک سے ڈھیر میں چھپا رہا۔ شام کے وقت میں نے سنا کہ میری ماں مجھے میرے اصل نام سے پکار رہی ہے۔ میں رینگتا ہوا باہر آیا اور مار کھانے کے لیے تیار تھا۔ لیکن انہوں نے مجھ نہ مارا اور نہ ہی یاد اس نے ڈانٹا۔ انہوں نے بس میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور ایک آہ بھری۔

انہوں نے ایک دور بھری یاد اس دن کی ہے جب میں اپنی والدہ کے ساتھ کیوں کے کھیت میں گندم کے خوشے جمع کر رہا تھا۔ جیسے ہی محافظ آیا سب نے دوڑ لگا دی لیکن چھوٹے پاؤں ہونے کی وجہ سے میری والدہ بھاگ نہ سکی اور محافظ نے انہیں پکڑ لیا اور اتنی زور سے تھپڑ رسید کیا کہ وہ زمین پر جا گریں۔ اس نے ہماری جمع کی ہوئی گندم ضبط کر لی اور سیٹی بجاتے ہوئے چل دیا۔ میری والدہ کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اُن کی آنکھوں میں ایسی مایوسی تھی جو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ سالوں بعد جب بازار میں میرا سامنا اس محافظ سے ہوا تو وہ بوڑھا ہونچکا تھا۔ میں نے اس سے بدلہ لینا چاہا لیکن میری والدہ نے مجھے روک دیا:

”بیٹے!! انہوں نے پیار سے کہا ”یہ آدمی کوئی اور ہے۔“

مجھے مون فیشنل کے دن اچھی طرح یاد ہیں کیونکہ یہ تہوار ان چند دنوں میں ایک تھا جب ہم سب کو پیالے میں ایک ایک ڈمپلنگ ملتی تھی۔ ایک بار تہوار کے دن ہم کھانے کی میز پر بیٹھے تو ایک بوڑھا فقیر آ گیا۔ میں نے اسے آدھا پیالہ شکر قندی دے کر بھیجنا چاہا لیکن اسے فضا آ گیا۔

میں ایک بوڑھا آدمی ہوں، اس نے کہا ”تم خود تو ڈمپلنگ کھا کر مر رہے ہو۔“

ہو۔ کوئی اتنے بڑے رحم کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے بھی غصے سے جواب دیا۔

”ڈمپلنگ کھانے کو ملتی ہے۔ تمہیں شکر گزار ہونا چاہیے کہ کم از کم تمہیں شکر قندی مل رہی ہے۔ میں نے تو دو در دو دفعہ ہوا جو میری والدہ نے میری سرزنش کی اور اپنا آدھا پیالہ فقیر کے پیالے میں ڈال دیا۔“

میری یادوں میں سے ایک یاد ایسی ہے جس کا مجھے بہت افسوس ہے۔ میں بازار میں خوشی بیچنے کے لیے اپنی والدہ کی مدد کرتا تھا۔ میں نے بچے وصول کرتے ہوئے ای ”جیاو“ زیادہ لے لیا۔ مجھے نہیں یاد کہ جان بوجھ کر کیا بھول کر۔۔۔ اور پھر سکول چلا گیا۔ جب میں شام کو گھر واپس آیا تو میری والدہ رو رہی تھیں۔ میں حیران تھا کیونکہ وہ بہت کم رویا کرتی تھیں۔۔۔ مجھے ڈانٹنے کے بجائے انہوں نے پیار سے صرف اتنا کہا:

”تم نے آج اپنی ماں کو شرمندہ کروا دیا۔“

ابھی میں کم سن ہی تھا کہ میری والدہ کو پیچھے چھوڑ کر بیماری ہو گئی۔ بھوک، بیماری اور کام کی زیادتی کی وجہ سے میرے خاندان کو بے پناہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ سامنے کوئی راستہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ مستقبل کے حوالے سے مایوس تھا۔ مجھے خدشہ تھا کہ والدہ خود کشی نہ کر لیں۔ ہر روز شام کو جب میں گھر واپس آتا تو سب سے پہلے اپنی والدہ کو آواز دیتا۔ ان کی آواز مجھے جینے کا حوصلہ دیتی اور اگر جواباً ان کی آواز نہ آتی تو میرے پاؤں تلے سے زمین نکل جاتی۔ میں انہیں آس پاس کے گھروں اور قریبی فیکٹری میں ڈھونڈنے چلا جاتا۔ ایک دن جب وہ کہیں بھی نظر نہ آئیں تو میں صبح میں بیٹھ کر بچوں کی

طرح و رنگ۔۔۔ عین اسی وقت وہ کمر پر ایندھن کے لیے کڑی لادے داخل ہو گیا۔ وہ بہت بارش ہو رہی تھی لیکن میں نے رونے کی اصل وجہ انہیں نہ بتائی۔ لیکن وہ جانتی تھیں۔۔۔ وہ بہت بیٹے انہوں نے تسلی دیتے ہوئے کہا:

”پریشان مت ہو، چاہے میری زندگی میں کوئی خوشی نہ ہو، لیکن میں تمہیں تب تک چھوڑ کر نہیں جاؤں گی جب تک پاتال سے خدا کا بلاوا نہیں آتا۔“

میں پیدائشی بد صورت تھا۔ گاؤں والے میرا مذاق اڑا دیا کرتے تھے اور سکول کے بد معاش لڑکے مجھے مارا کرتے تھے۔ جب میں روتا ہوا گھر پہنچا تو میری والدہ کہا کرتی:

”تم بد صورت نہیں ہو بیٹے۔ تمہاری ایک ناک اور دو آنکھیں ہیں، ہاتھ پاؤں بھی صحیح سلامت ہیں۔ تم بھلا بد صورت کیسے ہو سکتے ہو؟ اگر تمہارا دل صاف ہے اور تم ہمیشہ بھلائی کرتے ہو تو بد صورتی خود بخود دور ہو جاتی ہے۔“

بعد میں جب میں شہر منتقل ہو گیا تو پڑھے لکھے لوگ میری بیٹھ بچھے مجھ پر ہنسا کرتے تھے۔ کچھ تو میرے سامنے ہی میرا مذاق اڑاتے تھے لیکن ہر بار میں اپنی ماں کی یہی ہوتی بات یاد کرتا اور عاجزی سے معافی کا طلب گار ہوتا۔۔۔

جو لوگ پڑھنا جانتے تھے، میری والدہ اُن کی بہت عزت کیا کرتی تھیں۔ ہم اتنے غریب تھے کہ ہمیں کبھی بھی یہ پتہ نہ ہوتا تھا کہ اگلے وقت کا کھانا ملے گا یا نہیں لیکن جب بھی میں کتاب خریدنے یا لکھنے کے لیے کچھ خریدنے کی فرمائش کرتا تو میری والدہ وہ فرمائش ضرور پوری کرتیں۔

انہیں کام چور لوگ پسند نہیں تھے لیکن جب کتاب پڑھنے کی وجہ سے میں اپنے ذمے کا کام چھوڑ دیتا تو وہ کبھی کچھ نہ کہتیں۔۔۔

ایک بار بازار میں ایک داستان گویا اور میں چھپ کر اُس کی کہانی سننے پہنچ گیا۔ وہ ناخوش تھیں کہ میں کام چھوڑ کر کہانی سننے چلا گیا تھا۔ لیکن جب وہ رات کو مٹی کے تیل سے جلنے والے دیے کی روشنی میں ہمارے لیے سردی کے پڑے سی رہی تھیں تو مجھ سے رہا نہ گیا اور انہیں بار بار وہ تمام کہانیاں سنائیں جو بازار میں داستان گو نے سنائی تھیں۔ پہلے پہل تو انہوں نے بے دلی سے میری کہانی سنی کیونکہ اُن کے خیال میں داستان گو لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں اور وقت کا ضیاع کرتے ہیں لیکن جیسے جیسے میں کہانیاں سناتا گیا اُن کی دلچسپی بڑھتی گئی۔ اُس دن کے بعد انہوں نے مجھے اس بات کی مکمل اجازت دے دی کہ میں کام کے وقت جا کر مزید کہانیاں سن سکتا ہوں۔ اُن کی اس شفقت کے بدلے میں، میں گھر لوٹ کر انہیں کہانی کا ایک ایک لفظ سناتا کرتا تھا۔

جلد ہی میں داستان گو کی بنائی ہوئی کہانیاں دہرا دہرا کر اکتا گیا، اسی لیے میں نے اُن کہانیوں میں تبدیلیاں کرنا شروع کر دیں۔ میں اُن کہانیوں میں جان بوجھ کر وہ باتیں شامل کرتا جو والدہ کو خوش کر دیتی تھیں اور بعض اوقات کہانیوں کا اختتام بھی تبدیل کر دیتا کرتا تھا۔ آہستہ آہستہ سامعین کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ میری والدہ کے ساتھ میری بڑی بہنیں، میری خالہ اور میری نانی بھی دلچسپی لینے لگیں۔ کبھی کبھی کہانی سننے سننے میری والدہ تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہتی:

”تم بڑے ہو کر کیا کرو گے بیٹے؟ ایسے ہی بچوں کی طرح کہانیاں سناتے رہو گے۔؟“



اس کی ماں نے اسے نہیں یہ ہراس پڑھنے والے کے بارے میں سوال کیا تھا جو میری طرح سوچتا ہے تم کیا کہتی ہو؟

وہ اسے چپ دیکھ کر پھر سے دھمکے سے مسکراتا تھا۔  
”مگر آپ تو بہت خوب صورت ہیں۔ بچانے کیسے شافیہ کے منہ سے پھسل گیا تھا۔“  
”تو کیا خوب صورتی بس جسم کی ظاہری حالت میں ہی ہوتی ہے میں رویوں دھوکے اور وعدہ خلافی کو بھی بد صورتی سمجھتا ہوں۔“

وہ جیسے کسی تکلیف زدہ یاد میں کھویا تھا شافیہ کے دل کو کچھ ہوا۔  
اور آپ کتنے خوش قسمت بھی ہیں، یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ یاسیت سے لبریز تھا۔  
”مگر تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ میں خوش قسمت ہوں۔؟“

وہ متعجب ہوا تھا۔  
”یہ کہ آپ بہت کامیاب ہیں اور خوب صورت بھی ایک ایسے ملک میں ڈاکٹر ہیں جہاں زیادہ تر غیر ملکی مزدور یاں کرتے ہیں آپ کے پاس آرام کی ہر چیز موجود ہے اور کسی کے خوش قسمت ہونے کے لیے یہ سب کافی تو ہوتا ہے۔“  
شافیہ شاید زیادہ ہی مرعوب ہو چکی تھی وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر سکون سے بولا تھا۔  
”تم نے یہ کیسے طے کر لیا کہ کچھ مادی چیزوں کی فروانی کسی بھی انسان کی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے؟ کیا تم نے وہ جتنی تمہیں نہیں سی؟“  
”کون سی؟ شافیہ نے پوچھا تھا۔“

”وہ چینی بوڑھا جو پہاڑوں میں رہتا تھا؟ ہیرماں پے کہتا ہے۔“  
”ایک بوڑھے آدمی کا نام جنگ لنگ تھا، مطلب چٹانوں کا ماہر،“ اور اس کی پہاڑوں میں چھوٹی سی جائیداد تھی۔ ایک روز اس کے گھوڑوں میں سے ایک تم گم ہو گیا۔ اس کے ہمسائے آئے اور اس کے ساتھ بد قسمتی کی وجہ سے پیش آنے والے اس واقعے پر افسوس کرنے لگے۔  
اس بوڑھے نے لیکن پوچھا، ”تم نے یہ کیسے جانا کہ یہ بد قسمتی ہے؟“ پھر چند روز بعد وہ گھوڑا واپس آ گیا اور اپنے ساتھ جنگلی گھوڑوں کی ایک بڑی نگڑی بھی لے آیا۔ ہمسائے پھر آگئے اور اسے اتنی اچھی قسمت پر مبارکبیں دینے لگے۔ اس پر پہاڑوں میں رہنے والے بوڑھے نے پھر پوچھا، ”تم نے یہ کیسے جانا کہ یہ خوش قسمتی ہے۔“

اب چونکہ گھوڑے کافی زیادہ ہو گئے تھے، تو بوڑھے آدمی کے بیٹے کو گھڑسواری کا شوق ہوا۔ ایک دن اسی شوق کی تکمیل میں وہ اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا۔ ہمسائے پھر آگئے کہ اس بوڑھے سے افسوس کا اظہار کر سکیں۔ اس مرتبہ بھی اس نے ان سے یہی پوچھا، ”تم نے یہ کیسے جانا کہ یہ بد قسمتی کی بات ہے؟“

اگلے برس ”ریاستی لٹھ برداروں“ کا کمیشن پہاڑوں میں آیا تاکہ تو ان مردوں کو بادشاہ کی پیدل فوج کے سپاہیوں اور شاہی پالکیاں اٹھانے والوں کے طور پر بھرتی کر کے ساتھ لے جاسکے۔ انہوں نے بوڑھے کے بیٹے کو، جس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ ابھی ٹھیک نہیں ہوئی تھی، اپنے ساتھ نہ لے جانے کا

بجائے کیا۔ جنگ لٹھ یہ دیکھ کر مسکرا دیا۔“

وہ مسکرتا تھا۔  
”ہم کسی بھی انسان کو پر آسائش دیکھ کر اس کی خوش قسمتی کا اندازہ نہیں لکھ سکتے اور ناپی کسی کو ممکن یا امتحان میں دیکھ کر اسے بد قسمت تصور کیا جاسکتا ہے۔“

اس نے گہرا سانس لیا اور اسے کتابوں کی دنیا سے ہاتھ پکڑ کر باہر لے آیا تھا۔  
امید ہے تم کو بوار یا پسند آیا ہو گا یہ سکون اسن اور حسن کا صوبہ ہے اس کے دیہات حسین اور ان میں رہنے والی دو شیرائیں ملکوئی حسن کی ملائیں ہیں۔“

تعریف کا کچھ حصہ اسے پسند نہیں آیا تھا۔  
مگر شافیہ نے اپنی ناگواری کا اظہار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔  
”چلو تم فریش ہو جاؤ میں تم کو ناشتہ کروا تا ہوں۔“

وہ شاید دودھ سے سفید چکن کی طرف جارہا تھا جس کی ہر چیز سفید اور یکساں چمکی تھی شافیہ نے زندگی میں اتنے حسین چکن بس گوگل پے ہی دیکھ رکھے تھے۔  
ایسے شفاف جیسے بھی ان پر گرد کی تہہ ناجی ہو وہ اس چینی تمہیل کے بارے میں سوچتی ہوئی چھوٹی سی ڈانگ چھیر پر بیٹھ گئی تھی۔

اس کا چہرہ دہلا ہوا تھا۔  
کچھ دیر بعد وہ ایک سفید ٹرے میں ناشتے کے لوازمات لے کر آیا تھا۔  
”یہ پیاز بہت خالص ہے ایک بوارین لیدی بناتی ہے تم کو پسند آئے گا۔“

وہ اس کے لیے چائے بنا رہا تھا۔  
”اب تم ماں کے بارے میں بتاؤ۔“  
اس نے جی جی کا ذکر چھیڑ کر اسے آزر دہ کر دیا تھا۔

”وہ تو بس ایک لفظ ”محبت“ سے گندھی تھیں شاید انسان کے روپ میں کوئی فرشتہ تھیں۔“  
”میں جانتا ہوں میں ان کی محبت اپنی سانسوں میں محسوس کر سکتا ہوں آج میں جو کچھ بھی ہوں ان کی عنایتوں کی وجہ سے ہوں۔“

ہشام نے گہرا سانس بھرا تھا۔  
وہ بھی بھی خود کو اپنی ماں کے احسانات سے نکلا محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ وہ ایسا کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔  
اور شافیہ اس کی ماں کا دیا ہوا ایک تحفہ تھا تحفے کون قبول نہیں کرتا؟

✦✦✦  
خطیب کی زندگی جمود کا شکار ہو گئی تھی وہ ہنسا بھول گیا تھا بڑھتا بھول گیا تھا ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی کام ہی نہیں رہا بے مقصد کھڑکیوں کے پار دیکھتے رہنا۔ اس کے خواب جل گئے تھے جیسے اس کا پورا گھرانہ جل گیا تھا۔

”انتوا میں پڑے ہوا ایک خواب“  
لائسنٹن ہیو جز لکھتا ہے



التوا میں پڑے ہوئے خواب،  
 کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟!!!  
 کیا وہ انگوڑی طرح،  
 کڑی دھوپ میں پڑے رہتے ہے،  
 سوکھ جاتا ہے!  
 یا کسی زخم کی طرح،  
 تا سوز بن جاتا ہے!  
 کیا وہ گوشت کی طرح،  
 خشک ہو جاتا ہے!  
 یا چینی اور ملائی کی طرح،  
 پیٹھے اور ذائقہ دار!  
 یا کسی وزندار چیز کی مانند،  
 لٹکا رہتا ہے!  
 جو کبھی بھی اچانک،  
 دھماکے سے پھٹ سکتا ہے!!!

اس کا خواب التوا میں پڑا تھا یہ نہیں سوکھ گیا تھا یا جل گیا تھا اس نے کبھی اپنے خوابوں کی جلی ہوئی راکھ تک کو نہیں

کیونکہ یہ راکھ اس کی پینائی چھین لیتی تھی  
 اکثر سلی اور پر آ جاتی اور اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرتی تھی  
 خطیب کا کرایہ بھی خداداد بھر رہا تھا اور اس کا خیال بھی رکھتا تھا  
 سلی کو لگتا تھا خطیب کے اور اس کے دکھ مشترک ہیں  
 ایک دن بہت ہمت کر کے سلی نے خطیب سے پوچھا تھا  
 ”تمہارا دوست واپس نہیں آیا؟“  
 ”خداداد؟“ اس نے بے دھیانی سے پوچھا تھا پھر سلی کا چہرہ دیکھ کر نظری چرا گیا  
 وہ اسے بتا نہیں سکا تھا کہ اس کا دوست واپس آ چکا تھا  
 میں نے کچھ پوچھا ہے۔ اس نے سوال دوہرایا  
 ”ہاں وہ آچکا ہے۔“  
 ”پھر وہ تم سے ملنے کیوں نہیں آیا؟“  
 سلی نے پھر سے سوال کیا  
 ”وہ آئے گا جلد ہی“  
 ”کیا تم اس سے ملنا چاہتے ہو تو میں تم کو اس کے گھر لے چلوں؟“  
 سلی نے اسے آفر دی تھی

”میں نہیں وہ خود آئے گا وہ ایک ڈاکٹر ہے اس کی روٹیں اور مصروفیت ہمت الگ ہوتی ہے“  
 خطیب نے سرعت سے کہا تھا  
 ”کیا ہم انہی ٹیوٹ جایا کریں؟ ڈی سوزا ہر روز مجھے تحریک دیتی ہے“  
 ”کیوں نہیں اچھی لڑکی ہم ضرور جائیں گے“ وہ سلی کی خاطر مسکرایا تھا اس نے سلی کی خاطر حامی بھی بھری تھی اسے سلی زندگی کی طرف لوتی نظر آ رہی تھی  
 اپنا سارا گھر برباد ہوتا دیکھ کر اپنی زندگی کے اس شکستہ سوز پر خطیب کو سلی کا اور اپنا حال ایک جیسا لگتا تھا اس کا بھی خاندان کھو گیا تھا اور سلی کا بھی خاندان کھو گیا تھا  
 دونوں اپنے پیاروں کی قبروں پر رو بھی نہیں سکتے تھے زندگی درد کے ساتھ ہی مگرتا گئے بڑھنے لگی تھی  
 کیا یہ کم تھا کہ سائیس چل رہی تھیں اور صبح اور شام ایک خاص رفتار سے گزر رہے تھے اگلے دن کا سورج  
 روشنی اور تمازت لے کر آیا تھا سلی حقیقت میں اپنے اسکول (لیگنوج اسٹینٹ) جانے کے لیے  
 خطیب کی منتظر کھڑی تھی: اس نے ڈی سوزا کو بھی متعجب کیا تھا اور اس کے دونوں ہمدر دوست اس کے  
 ساتھ اسکول جانے کے لیے تیار تھے ان کی یہ خوشی ان کے چہرے سے کھل چکی تھی اور وہ دوست اس کے  
 ساتھ اسکول جا رہے تھے وہ ایسے باتیں کر رہے تھے جیسے کسی کی بھی زندگی میں کوئی زلزلہ نہیں آیا تھا۔  
 اسکول میں بہت سارے دوستوں نے ان کو دیکھ کر ہلکے ہلکے ہنسنے لگے تھے مگر سلی کی سچائی بڑھ رہی تھی پھر ایک دن اس  
 والے بے شمار دن سبک خرازی سے گزرنے لگے تھے مگر سلی کی سچائی بڑھ رہی تھی پھر ایک دن اس  
 نے خداداد کی کلاس کے باہر کھڑے ہو کر اس کا انتظار کیا تھا تب وہ پھر بن رہا تھا  
 اندر سے آواز آرہی تھی  
 خلیل جبران کی کوئی نظم پڑھی جا رہی تھی  
 ”اولاد“

تمہارے بچے تمہارے بچے نہیں ہیں  
 ان کو تو زندگی نے خود اپنے سلسل کی خاطر جنم دیا ہے  
 تم ان کے دنیا میں آنے کا ذریعہ ضرور مگر وجہ ہرگز نہیں ہو  
 اور کو کہ وہ تمہارے ساتھ رہتے ہیں، مگر تم ان کے مالک بالکل نہیں  
 تم اپنی ساری محبت ان پر وار سکتے ہو، مگر اپنی سوچ ان کو نہیں دے سکتے  
 کہ وہ اپنے خیالات کے خالق و مالک خود ہی ہیں  
 تم ان کے جسموں کو اپنے پاس رکھنے پر قادر ہو، مگر ان کی رو میں آزاد ہیں  
 ان کی رو میں مستقبل کے مکانات کی تعمیر ہیں  
 اور مستقبل کی ان آماجگا ہوں کا تصور تم اپنے خوابوں میں بھی نہیں کر سکتے  
 تم ان جیسا بننے کی کوشش تو کر سکتے ہو  
 مگر انہیں اپنے جیسا بنانے کی حماقت مت کرنا  
 کہ زندگی کا پیہ آگے کی طرف چلتا ہے ناکہ پیچھے کی طرف، اور نا ہی اس کی فطرت میں ایک جگہ  
 رُکے رہنا ہے



ختم اک کمان کی طرح ہو جس میں سے تمھاری اولاد تیر کی طرح نکل کر وقت کے دھارے میں شامل ہوتی جاتی ہے۔  
تمھارا خالق، تمھارا تیر انداز، تمھارے تیروں کے لئے لامحدود مستقبل میں بے کردہ اہداف دیکھ سکے پر قادر ہے  
وہ تیروں کو اپنے ہدف تک پہنچانے کے واسطے ختم پر، جو اسکی کمان ہو، کچھ سختی بھی روا رکھتا ہے کہ وہ تیروں کو دور، اپنے اہداف کی طرف سبک انداز سے بھیج سکے  
ختم اپنے تیر انداز کو اجازت دو کہ وہ اپنے ہاتھوں کی مضبوطی تمھیں استعمال کرنے میں برت سکے کہ تیر انداز کے لئے تیروں کا اپنے ہدف کی طرف بڑھنے کا نظارہ اتنا ہی پر لطف ہے جتنا اپنی کمان کو کارآمد دیکھنا۔

اس نے نظم کے خاتمے کا انتظار کیا اور کلاس ختم ہوتے ہی خداداد کو اشارہ دیا  
خداداد جانک گھبرا گیا تھا اسے واضح محسوس ہوا تھا خداداد کے چہرے کا رنگ بدلا ہے اس نے سنجیدگی سے مسکرائے کی کوشش کی تھی مگر کئی تو مسکرا بھی نہیں سکی تھی

”ہشام کہاں ہے؟“  
سلی کو لگا تھا اس کی اپنی بازگشت دور دور تک سنائی دے رہی تھی  
”میں جانتی ہوں وہ لوٹ آیا ہے۔“

خداداد سن ہو گیا تھا  
”تمھاری خاموشی کے پیچھے جو حقیقت ہے وہ سننے آئی ہوں۔“  
”تم نے خطیب سے کیوں نہیں پوچھا؟“

خداداد نے جواب دیا  
”تم سے جو پوچھ رہی ہوں“ سلی کا لہجہ سرد تھا  
”وہ مصروف ہے تم سے خود ملے گا۔“

اس نے جواب دیا تھا  
اور سچ میں ایک طویل چپ نے چادر تان لی تھی کوئی بوار یا کے اس عظیم انٹی ٹیوٹ کی گرین گہاس پریشانی بوارین لوکل منگر گار ہی تھی  
تم زندگی کے کتنے برس جی چکے ہو اور تم کس فیشن کے کپڑے پہنتے ہو تمھاری جسامت کیسی ہے یا پھر تمھارے بالوں کی رنگت کیا ہو چکی ہے یہ سب تمھاری پہچان نہیں! تمھارا نام بھی تمھارا تعارف نہیں

اور ہنستے وقت جو تمھارے گالوں میں گڑھے پڑھتے ہیں وہ بھی نہیں تمھارا تعارف تو وہ سب کہاں ہیں جو تم نے نہیں دیکھا وہ بھی نہیں یادہ الفاظ ہیں جن کا انتخاب تم نے اپنے اظہار کے لئے کیا ہے  
ختم آنکھ کھلنے کے فوراً بعد تمھاری بھڑکی، کھردری آواز تمھارا اصل ہے یادہ ہنسی ہے جسے تم ہونٹوں میں دبائے کی کوشش کرتے ہو  
ختم اپنے ہتھکڑیوں میں چھپے لطیف و شوخی کا پیکر بھی ہو اور اپنی آنکھ سے نکلے ہر آنسو کا عکس بھی

ختم ان سب گیتوں کی بازگشت ہو جو تم نے کبھی اکیلی، بلند آواز اور بے فکری سے گائیں  
ختم ان رستوں کا تعارف ہو جن پر تم نے سفر کیا ہے اور ان منازل کا پتہ ہو جن کو تم نے اپنا مسکن چنا ہے  
ختم ہر اس سچ کا حصہ ہو جسے تم ایمان سمجھتے ہو اور ہر اس شخص کا بھی جس سے تم نے محبت کی ہے

تمھارے ہیڈ روم میں تنگی تصویریں تمھیں بیان کرتی ہیں اور تمھارے مستقبل کے ارادے تمھارے حوصلوں کا پتہ دیتے ہیں  
تمھارا وجود خوبصورتی کے انمول خزانے سے اٹھا ہے مگر لگتا ہے کہ شاید تم یہ سب بھول چکے ہو  
کہ تم نے اپنے تعارف کے لئے وہ سب حوالے پئے ہیں جو ہرگز تمھیں بیان کرنے کے لائق نہیں اور خاموشی بولتی رہی

تمام سچائیاں ایک بھیا تک حقیقت بن کر ناچتی رہیں  
”وہ مجھ سے ملنے نہیں آیا؟“  
اس نے آنسو لی لیے تھے

”اس کو مجھ پر گزرنے والی واردات کا شاید نہیں پتہ ناچاہتے ہوئے بھی وہ رو پڑی تھی  
”تم کو حوصلہ کرنا ہو گا سلی خداداد کو بولنا پڑا  
”دیکھو خطیب کی طرف کہ وہ کس قدر زخمی ہے مگر جی رہا ہے انسان کو جینا پڑتا ہے زندگی میں سب کچھ حاصل نہیں ہو جاتا۔“

وہ اسے سمجھا رہا تھا  
”وہ سب ٹھیک ہے میں کوشش تو کر رہی ہوں“ وہ ضبط سے بولی تھی  
”مگر ہشام آیا کیوں نہیں؟“

”تم جانتی ہو نا وہ ایک ڈاکٹر ہے وہ اپنی مصروفیت سے وقت نکال کر ضرور آئے گا وہ تم کو اس بے وقت میں بھی تنہا نہیں چھوڑے گا۔“



وہ اسے تار و پود سمجھاتا رہا تھا  
"کیا یہ ممکن ہے ہم دونوں اس سے ملنے خود چلے جائیں۔"

سلی نے کسی آس سے پوچھا تھا  
"یہ ممکن تو ہے مگر مجھے کچھ کام ہے ہم جلد اس سے ملیں گے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ خدا داد نال رہا  
ہے مگر سلی کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا  
وہنا چاہتے ہوئے بھی مان گئی تھی  
جب وہ گھر کے راستے کی طرف گامزن تھی اس کا دل آزرده تھا ایک ایسی بے سکونی تھی جو محبت  
کرنے والوں کو محبوب کی طرف سے اکثر لاحق رہتی تھی  
آج رستے بھی ادا اس تھے کئی دنوں بعد بھی یہ جانے مانے بڑے آسودہ نظر نہیں آ رہے تھے  
رابرٹ فراسٹ کی ایک نظم کو سوچتے ہوئے وہ اس دوہری تکلیف میں مبتلا تھی جو اس کے ضمیر اور  
پینٹ نے اٹھا رکھی تھی

زرد جنگل میں دور راستے ہو رہے تھے جدا،  
اور انیسویں دونوں پہ چلتا تو ممکن نہ تھا  
مجھ کو ہونا تھا بس ایک سی کا مسافر، میں دیکھا کیا  
دیر تک ایک کو جدا امکان تک  
وہاں تک جہاں ہو رہا تھا وہ خم کھا کے جنگل میں گم،  
میں نے پھر دوسرے کو لیا، وہ جو اتنا ہی خوش رنگ تھا،  
مدی بھی زیادہ تھا شہسی اُس پہ گھاس اور وہ قدموں کی طالب تھی؛  
گو اُس جگہ آمدورفت سے  
دونوں یکساں ہی پامال تھے،  
اور اُن صبح دونوں پہ تھے  
راگبیروں کے قدموں سے محفوظ پتے۔  
میں نے پہلے کو چھوڑا کسی اور دن کے لیے!  
گو کہ معلوم تھا کیسے اک راہ سے دوسری رہ نکلتی ہے،  
اور وہ ایسی کتنی دشوار ہوتی ہے۔  
میں بیاں کر رہا ہوں گا اک آہ بھر کے  
کہیں آج سے سالہا سال بعد:

ایک جنگل میں دور راستے ہو رہے تھے جدا، اور میں۔۔  
میں نے وہ چن لیا جس پہ کم آمدورفت رہتی رہی،  
اور اسی بات نے فرق ڈالا تمام۔

جب وہ گھر کے قریب پہنچی تو اس کی دور کی پڑوسن نے اس کو دیکھ کر کراہیت سے منہ موڑ لیا اور اس  
کی ساٹھی لڑکی نے اسے ٹھوکا دے کر پوچھا تھا

"کیا یہ وہی ہے؟"

دوسری نے اشارے کی جگہ اپنی زبان سے اسے زخم دیا  
"ہاں یہ وہی ہے جس کی بے شری نے اس کا پورا گھر کھا دیا اور یہ پھر بھی زندہ ہے۔"  
اس کے انداز میں اتنی نفرت تھی کہ سلی اس نفرت سے کن ہو رہی تھی  
"اے تو سوسائیز کر لینی چاہیے تھی۔"  
"مگر یہ کہ مرتے تو غیرت مند لوگ ہیں۔"

وہ دونوں اس کا استہزا اڑا رہی تھیں  
"تو کیا یہ اپنے بوائے فریڈ کا بچہ نہیں جنے گی؟"

"پہلی والی نے مزہ لیا تھا  
"اس کا تو ریب ہو گیا تھا"

سلی کو لگا تھا اس کے تمام زخم ادھر گئے تھے۔  
"تو اس کا بوائے فریڈ کدھر گیا ہے؟"

"چھوڑ گیا ہو گا ایسی لڑکیوں کے ساتھ کون رہ سکتا ہے؟"

اور سلی کا سارا بدن ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اس نے اپنے کانوں پر دونوں ہاتھ رکھ لیے تھے۔ میری آبرو  
ریزی میں تو جو چاہے بکواس کر میری خاموشی کینوں کا جواب ہوتی تھیں بھی نہ عیدیم الجواب نہیں  
ہوتا مگر یہ مناسب نہیں کہ شیرکتوں کو جواب دے  
اسکے موبائل پر ایک پیج آیا تھا

اس نے دھندلی آنکھ سے اسکرین کی طرف دیکھا تھا اور اس کا دل جیسے لرز گیا تھا۔ آج اتنے دن  
بعد اس کے سچا کا پیام آیا تھا صلی جیسے باؤلی سی ہو گئی تھی  
تمہارے وجود کا ہر ذرہ؛ مجھے اپنے وجود کی طرح پیارا ہے اور تمہارے ہر درد و غم میں یہ مجھے  
ایسے ہی پیارا رہے گا۔ تمہارا ضمیر میرا خزانہ ہے مگر یہ شگیتہ و چور ہے تو پھر بھی یہ میرا خزانہ ہی  
ہے۔۔۔

Every atom of your flesh is as dear to me as my own: in  
pain and sickness it would still be dear. Your mind is my  
treasure, and if it were broken, it would be my treasure  
still...

Charlotte Brontë: Jane Eyre

Sender doctor hasham

اور سلی کو لگا تھا جیسے ہشام اس کے زخم چنے کو بہت دور پہنچ کر بھی اس کا درد پورا محسوس کر رہا ہے۔  
سلی کے اندر ایک امید جاگ اٹھی۔ اور وہ جیسے ہر درد سے آزاد ہو کر اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی  
تھی اس کے اندر مایوسی نہیں تھی مگر ایک عزم دیکھا جاتا تھا  
آج وہ گھر جانے کی بجائے اپنے پیاروں کی قبروں پر گئی تھی۔ اور پھر باڑے کی طرف آئی۔







کلی سوچ رہی تھی کہ اس کی زندگی اس بوجھ سے آزاد ہو جو اس نے زبردستی کا اٹھا رکھا تھا

شافیہ نے ایک سنہری صبح کو چمکتے دیکھا تھا وہ اس حسین سویر کی کتنی جلدی عادی ہو گئی تھی وہ اس سفید گھر میں اکیلی مائلن بھی اس کا مالک تو رات رات بھر ہسپتال میں رہتا تھا دن کو سوتا شام کو جم جاتا اور رہی شافیہ تو وہ اس گھر میں اتنی آزادی کہ اس آزادی کا وہ بھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اس صبح اس نے پیر نصیر کا کلام سسٹم میں لگا دیا تھا تاکہ گھر میں گونجتی آواز اس کی تنہائی کو کم کر سکے

”میری زندگی تو فراق ہے، وہ ازل دل میں تکیں سہی  
وہ نگاہ شوق سے دور ہیں رگہ جاں سے لاکھ قریں سہی  
ہمیں جان دینی ہے ایک دن وہ کسی طرح، وہ کہیں سہی  
ہمیں آپ کھینچے دار پر جو نہیں کوئی، تو ہمیں سہی  
غم زندگی سے قرار کیا یہ سکوں کیوں، یہ قرار کیا  
غم زندگی بھی ہے زندگی، جو نہیں خوشی تو نہیں سہی  
مسکطور ہو، مسکحشر ہو، ہمیں انتظار قبول ہے  
وہ کبھی ملیں، وہ کہیں ملیں، وہ کبھی سہی وہ کہیں سہی  
نہ ہو، ان پہ جو میرا بس نہیں کہ یہ عاشقی ہے ہوس نہیں  
میں انہیں کا تھا، میں انہیں کا ہوں وہ مرے نہیں، تو نہیں سہی  
مجھے بیٹھنے کی جگہ ملے، بری آرزو کا بھرم رہے  
تری انجمن میں اگر نہیں، تری انجمن کے قریں سہی  
ترے واسطے ہے یہ وقف مر، رہے تابدار ترا سنگ در  
کوئی سجدہ ریز نہ ہو سکے تو نہ ہو، مری ہی جیوں سہی  
مری زندگی کا نقیب ہے نہیں دور، مجھ سے قریب ہے  
مجھے اس کا غم تو نصیب ہے، وہ اگر نہیں تو نہیں سہی  
جو ہو فیصلہ وہ سنائیے، اسے حشر پر نہ اٹھائیے  
جو آپ کریں گے ستم وہاں، وہ ابھی سہی، وہ یہیں سہی  
اسے دیکھنے کی جو لو لگی نصیر، تو دیکھ ہی لیں گے ہم  
وہ ہزار آنکھ سے دور ہو، وہ ہزار پردہ نشیں سہی۔“

(باقی آئندہ)



PARHLO PAKISTAN

اب آپ ہر قسم کے ناول ہماری ویب سائٹ  
سے مفت حاصل کر سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ ہماری ویب سائٹ ناولز رہٹرز کے لئے آفر  
بھی دیتی ہے۔ اگر آپ لکھنے کے شائق ہیں تو ہم سے رابطہ  
کریں۔ آپ کے ناولز کے علاوہ ناول کے بہترین ہونے  
پر آپ کو کیش پرائز بھی دیں گے

ابھی اپنا ناول EMAIL کریں اور اپنے لکھاری ہونے کا فائدہ اٹھائیں۔

WHATSAPP GROUP : 0318-9992829

PARHLO.COM.PK@GMAIL.COM